© rasailojaraid.com

مقالہ خصوصی
قسط سوم

حکیم محمود احمد ظفر

جمہوریت ایک فتنہ اور فراڈ

پاکستان میں وزیراعظم بھٹو نے قریباً سات سال حکومت کی۔ اس سات سال کے عرصہ میں اس کی کسی غلط بات سے اس کی پارٹی کے کسی رکن نے اختلاف نہیں کیا۔ اگر کسی نے ہمت مردانہ سے کام لے کر اختلاف کی جرأت کرلی تو پھر اس کا جو حشر ہوا اس کی داستان ظلم بڑی طویل ہے اور دلائی کیمپ، آزاد کشمیر کے کھنڈرات اور جیل کی کال کوٹھریاں اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ دوسری طرف حزب اختلاف کے اراکین اسمبلی کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کی گواہی بھی اخبارات کے صفحات میں موجود ہے۔ اس سات سالہ دور میں حزب اختلاف کا پورے ملک میں کوئی جلسہ نہیں ہونے دیا گیا۔ اور دستور و آئین کی منظوری کے وقت حزب اختلاف کے اراکین کو F.S.F کے ذریعہ کس طرح ٹانگوں سے پکڑ کر باہر پھینکا گیا۔ تاریخ کے اوراق ان تمام ظلم و ستم کے واقعات کو اپنے سینے سے محو نہیں کر سکتے۔

اسی وجہ سے الفرڈ کابن نے لکھا ہے کہ

"جمہوریت اس بات کی متقاضی ہے کہ کوئی صحیح رائے عامہ (General will) (پھر اور اس رائے عامہ کے تجریدی تخیل) (Abstract Idea) کو جب محسوس اور مرئی شکل میں منتقل کیا جاتا ہے تو اسی میں سے منطقی طور پر آمریت ابھر آتی ہے۔

(Alfred colbox, the crisis of civilization, P.26)

یہ آمریت ضروری نہیں کہ کسی فرد واحد ہی کی ہو بلکہ ایک پارٹی اور ایک گروہ بلکہ ایک خاندان کی بھی ہو سکتی ہے۔ البتہ جو شے ان سب کے درمیان قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ مسند اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد افراد، گروہ اور خاندان ان لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو بالکل غیر مسئول سمجھتے ہیں کہ وہ بلاشرکت غیرے ان لوگوں پر حاکم بلکہ ان کے مالک ہیں جن کے ووٹ لے کر وہ مسند اقتدار پر قابض ہوئے تھے۔ الفرڈ کابن نے بالکل درست کہا ہے کہ

"عوام کو حاکمیت کا سونپ دیا جانا ان کو وہی حقوق عطا کر دیتا ہے جو الٰہی حقوق کے نظریہ (The Divine Right of King) کی رو سے ازمنہ وسطیٰ میں بادشاہوں کو حاصل تھے۔ اور اس طرح جن جن بے اعتدالیوں کے وہ بادشاہ مرتکب ہوتے تھے انہی بے اعتدالیوں کا ارتکاب آج حاکمیت جمہور کے نام پر جمہور کے یہ ٹھیکیدار اور دنیا کا عیار طبقہ کر رہا ہے"۔

۸۔ اسلامی نظام حکومت اور جمہوریت میں ایک واضح فرق یہ بھی ہے کہ اسلامی نظام حکومت میں بندوں کو تولا جاتا ہے جبکہ جمہوری نظام حکومت میں بندوں کو گنا جاتا ہے یہ نظام فطرت کے خلاف ہے کہ ہر شخص کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رائے کا وزن ایک جیسا ہو۔ ہمارا ہر روز کا مشاہدہ ہے کہ ہر حکومت اور دنیا کے ہر خطہ میں ہر شخص کا الگ الگ مقام ہے۔ آفیسر، کلرک اور چپڑاسی ان کی تنخواہوں میں بہت تفاوت ہے حالانکہ دیکھتے ہیں یہ سب ایک جیسے انسان ہیں، لیکن ان کی قابلیتوں کی وجہ سے ان کی آراء میں بہت تفاوت ہے۔ ان کی تنخواہوں کا فرق ان کی ذہنی پختگی اور ارتقاء کی وجہ سے ہے۔ یہ ایک فطری قانون کے تحت ہے۔ ایک جاہل اور ان پڑھ کا مقام وہ نہیں جو ایک عالم اور ماہر فن کا ہے۔ اسی شے کو قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

هَل يَستَوِی الَّذِينَ يَعلمون وَالَّذِينَ لَا يَعلمُون

"علم والے اور جاہل برابر نہیں ہیں۔"

لیکن اس غیر فطری نظام جمہوریت میں جاہل اور عالم، ماہر فن اور غیر ماہر فن، مفتی اعظم اور ان پڑھ، وزیر اعظم اور چوکیدار، سربراہ مملکت اور مڈل پاس چپڑاسی سب کی رائے اور ووٹ کی ایک ہی قیمت ہے۔ بلکہ وقت کے قطب اور ابدال اور ایک زانی اور شرابی، ایک دانشور اور پاگل کے ووٹ کی ایک ہی حیثیت ہے جو کہ خلافِ فطرت اور خلاف علم و دانش ہے۔ اس لحاظ سے جمہوریت نہ صرف خلاف اسلام بلکہ خلاف علم و دانش اور خلافِ فطرت بھی ہے۔ جمہوریت کے دلدادہ اگر ووٹ کے معاملہ میں سب انسانوں کو ایک ہی مقام دیتے ہیں تو اپنے روزمرہ کے معاملات میں ہر شخص کی رائے کو ایک حیثیت کیوں نہیں دیتے؟ مختلف دفاتر میں آفیسر اور کلرک کا نشیب و فراز کیوں ہے؟ اسی شے کو علامہ اقبال یوں بیان کیا ہے۔

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

مشہور ماہر سیاسیات ڈاکٹر برکے (Burke) نے جمہوریت کی اس خرابی کے بارہ میں لکھا ہے۔

"جمہوریتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جمہوریت کی یہ شرائط شاذ و نادر ہی پوری ہوئی ہیں۔ عملی اعتبار سے جمہوریت دراصل جہالت کی حکمرانی کا نام ہے۔ اس کی ساری توجہ کمیت اور تعداد پر رہتی ہے۔ اس میں ووٹ گنے جاتے ہیں انہیں تولا نہیں جاتا۔"

۹۔ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت میں جمہور کی فرمانروائی اور سیادت تسلیم کی جاتی ہے، لیکن یہی چیز جمہوریت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ جمہور کسی مستقل اور پائیدار چیز کا نام نہیں بلکہ یہ ایک بڑی لوچدار چیز ہے جو ہر زور دار چیز سے دباؤ کھا کر اپنی شکل بدل دیتی ہے۔ اس سے روٹی، کپڑا اور مکان کا فراڈ کیا جاسکتا ہے۔ اس کا استحصال کیا جاسکتا ہے۔ اس کو لالچ دیا جاسکتا ہے۔ اس کو مشتعل کیا جاسکتا ہے۔ اس کو دھوکہ دیا جاسکتا ہے۔ ایسی غیر مستقل چیز پر جس ریاست کی بنیاد رکھی جائے گی اس میں نہ تو استقلال و پائیداری پائی جاسکتی ہے اور نہ ہی وہ انسانیت کے لئے مفید ہوسکتی ہے۔ خود پاکستان میں گذشتہ سالوں میں ایک شخص نے لوگوں کو روٹی کپڑا اور مکان کا لالچ دے کر پاکستان کو دولخت کر دیا اور پاکستان میں ایک ایسی حکومت قائم کی جس کے دلائی کیمپ کی داستانیں لوگ ٹیلیویژن پر باچشم گریاں سناتے تھے۔ جس میں ملک کی تمام ترقیاتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسکیمیں رک گئیں اور عوام اس کے پنجہ ظلم و ستم کے نیچے کراہنے لگے۔ پھر چشم فلک نے یہ زمانہ بھی دیکھا کہ جمہور اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جمہور کوئی پائدار اور مستقل ارادہ نہیں رکھتا کہ اس کے اجتماعی ارادے کو بنیاد بنا کر کسی ریاست کا نظام بنایا جائے۔

جمہوریت کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ اقتدار کی باگیں عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں دے دی جائیں لیکن عوام اور جمہور جن کو اتنا بڑا اور اہم کام سپرد کیا جاتا ہے خود ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ غربت ان کے اندر غور و فکر اور سوچ و بچار کی ساری صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے۔ ان میں اتنی بصیرت اور اتنی سمجھ بوجھ نہیں ہوتی کہ وہ اپنے نفع و نقصان کا صحیح طور پر فیصلہ کر سکیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی حمایت کرنا اپنی زندگی کا کمال سمجھتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی بلکہ ان کی آواز ان کے گروہ اور پارٹی کی صدائے بازگشت ہوتی ہے۔ چنانچہ پروفیسر ہیرلڈ لاسکی (Laski) لکھتا ہے کہ

"رائے عامہ کا سرچشمہ نہ تو علم ہے اور نہ عقل و فہم، بلکہ اُسے ہمیشہ اپنے اپنے گروہ اور پارٹی کے مفادات جنم دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے انتخابات میں فیصلے ایسے عجیب و غریب وجوہ کی بنا پر کئے جاتے ہیں جن کا کسی طرح بھی علمی تجزیہ (Scientific Analysis) نہیں کیا جا سکتا۔"

(Crisis of Democracy P.21)

پاکستان میں تو یہ بات اظہر من الشمس ہے، لیکن پاکستان کے علاوہ دوسرے مختلف ممالک کے انتخابات کا اگر ایک سرسری جائزہ لیں تو یہ بات نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ لوگ عموماً کسی کو آگے لگاتے وقت اور قوم کی زمام اس کے ہاتھ میں دیتے وقت اس کے اخلاقی اور ذہنی اوصاف نہیں دیکھتے۔ وہ اکثر صرف یہ دیکھتے ہیں کہ وہ نعرہ کتنے زور کا لگاتا ہے اور زبان کے استعمال میں کس قدر مطلق العنان ہے۔ وہ انہی لوگوں پر فریفتہ ہوتے ہیں جو ان کا رخ حقائق سے موڑ کر انہیں آرزوؤں اور تمناؤں کی جنت میں لے چلیں۔ وہ حقائق سے آشنا کرنے والوں اور عقل کی بات بتانے والوں کو اپنا دشمن اور خوش کن باتیں کرنے والوں اور بھڑکیں مارنے والوں کو اپنا محسن اور خیر خواہ سمجھتے ہیں۔ وہ اسی شخص کے نعرے لگاتے ہیں جو ان کے سامنے انہیں ہوائی خوشنما باتیں پیش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے نمائندگان کے انتخاب میں پیہم غلطیاں کرتے ہیں لیکن پھر بھی نصیحت نہیں پکڑتے۔ وہ اندھی تقلید اور بہری پیروی کے اس قدر خوگر ہو جاتے ہیں کہ کوئی خوفناک سیاسی حادثہ بھی ان کی آنکھیں نہیں کھول سکتا، یہاں تک کہ اگر ان کا محبوب قائد کوئی ملک دشمن کارروائی بھی کر دے، ملک کو دو لخت بھی کر دے پھر بھی وہ مختلف تاویلات سے اس کے اس فعل کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر ان چالاک، عیار طالع آزماؤں (Dpportunists) کو منتخب کر لینے کے بعد وہ یہ نہیں سوچتے کہ انہیں ان کے رہبر کدھر لے جا رہے ہیں۔

ٹامس کارلائل (T. Carlyle) نے جمہوریت کی اسی کمزوری کے باعث یہ کہا تھا:

"جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جس میں اعلیٰ اور نیک خصلت مگر خاموش انسانوں کے لئے کوئی جگہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں۔ یہاں اقتدار لاف زنی کرنے والے دھوکہ بازوں کے حصے میں آتا ہے"

نہ صرف کارلائل نے بلکہ دوسرے یورپی ماہرین سیاسیات نے بھی جمہوریت کی اس کمزوری اور نقص کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ بلیکی (Blakie) نے بہت سی مثالیں دے کر اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ عوام اور جمہور فتنہ انگیز خطیبوں، بھڑکیں مارنے والے قائدوں اور سبز باغ دکھانے والے سیاست دانوں کے بھروں میں آجاتے ہیں۔ سیاسی طالع آزماؤں کی ظاہری شان و شوکت انھیں موہ لیتی ہے۔ اس مفتوح ضمیر کے ساتھ یہ لوگ اپنے اندر اتنی اہلیت اور قوت نہیں پاتے کہ وہ اپنے میں سے کسی بہتر آدمی کو منتخب کرلیں، لہذا وہ ملک کی عنانِ اقتدار نااہل اور عیار لوگوں کے سپرد کردیتے ہیں۔

حکومت کے مسائل علم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جمہور زیادہ تر جاہل ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ مختلف امیدواروں کی تقاریر سُن کر یہ فیصلہ ہی نہیں کرپاتے کہ کون صحیح بات کہہ رہا ہے اور کون غلط۔ کیونکہ قومی اور بین الاقوامی مسائل کو سمجھنے کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تعلیم بھی وہ جس کا ان مسائل سے تعلق ہو۔ جمہور غریب ہونے کی وجہ سے یہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرسکتے کیونکہ اس زمانہ میں تعلیمی اخراجات اس قدر زیادہ ہیں کہ دولت مندوں کے علاوہ دوسرا ان کے بار کا متحمل نہیں ہوسکتا، اس وجہ سے غریب تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔

دوسرے سرمایہ دار طبقہ جو حکومت کی مسند پر براجمان ہوتا ہے، وہ بھی اپنی زندگی کا ستر نہاں جمہور کی جہالت ہی میں پنہاں پاتے ہیں۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ غریب طبقہ میں فکر و احساس کی لہریں پیدا ہو گئیں تو ہماری زندگی خطرہ میں ہوگی۔ حکمران طبقہ کی ساری کوششیں اسی بات پر مرکوز رہتی ہیں کہ جمہور زیادہ سے زیادہ جاہل رہیں۔ اور اگر ان کو کوئی تعلیم دی بھی جائے تو وہ ایسی تعلیم ہو جو ان کے اندر غور و فکر کی صلاحیتیں اُبھارنے کی بجائے ان کے ذہنی قوت کو یک قلم معطل اور مفلوج کردے۔ اور انھیں امور مملکت میں دل چسپی لینے کی بجائے صبح و شام صرف ایک ہی فکر ہو اور وہ روٹی کمانے کی فکر۔ چنانچہ ہیرلڈ لاسکی (Herald Laski) نے لکھا ہے۔

"اگر علم کی کلید غریبوں کے ہاتھ میں دے دی جائے تو وہ اس بات کو سوچنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ اس نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا جائے جو بغیر کسی منصفانہ اصول کے معاشرہ میں عدم مساوات کو روا رکھتا ہے۔ اس لئے تمام وہ حکومتیں جو عدم مساوات کی بنیاد پر قائم ہیں، وہ اپنی قوت لوگوں کی جہالت سے حاصل کرتی ہیں، اور اس کے لئے ملک میں ایسا نظام تعلیم رائج کرتی ہیں جو اس غلط اساس کو کم از کم صدمہ پہنچائے۔ لہذا ان کے ہاں تعلیم کا مقصد لوگوں کو زیور علم سے مزین کرنا نہیں ہوتا بلکہ سرمایہ داری کو ہر قسم کے حملوں سے محفوظ کرنا ہوتا ہے۔

(H. Laski, Crisis of Democracy, P. 56)

۱۰۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ جمہوریت عوام کی یا عوام کی اکثریت کی حکومت ہوتی ہے۔ یہ بھی عوام کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک بہت بڑا فراڈ ہے۔ کیونکہ اول تو اکثریت کی رائے کا اندازہ کس طرح لگایا جاسکتا ہے۔ ایک شخص کے لئے جو معاشرہ میں رہتا ہے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ بغیر دباؤ کے اپنی اصل رائے کا اظہار کر سکے۔ مشہور ماہر سیاسیات الفرڈ کابن (Alfred Colbon) نے اس بارہ میں لکھا ہے۔

"کسی قدیم قوم کے لئے اپنی رائے کا اظہار عملی طور پر کرنا ممکن تھا، لیکن اب اکثریت آبادی کی وجہ سے گروہ جس قدر بڑھتے جائیں گے اسی تناسب سے ایک فرد کے لئے یہ دقت پیدا ہوتی چلی جائے گی کہ وہ اپنی رائے کے مطابق عمل کرے، اور اسی نسبت سے متضاد آراء بھی معرض وجود میں آتی جائیں گی۔ اس لئے اس کی عملی شکل سوائے نمائندگی کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہ مسئلہ ماہرین نفسیات کی سمجھ سے بالا ہے کہ دو چار یا آٹھ کروڑ انسانوں کی رائے کی صحیح طور پر کس طرح ترجمانی کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تک کوئی ایسا سیاسی منتر بھی دریافت نہیں ہوسکا جس کے ذریعہ چار کروڑ افراد کی آراء کا اظہار کیا جاسکے۔ ان حالات میں جبکہ نمائندگی کا پورا نظام مثلاً الیکشن، پارٹیاں، کابینہ وغیرہ عوام اور آخری حکمران کے درمیان مائل ہو۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ عوام کی صحیح رائے معلوم کی جاسکے۔ مختلف سیاسی جماعتوں کا مختلف سیاسی نظریات کے ترجمان کی حیثیت سے جنم لینا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ سماج میں مختلف مفادات پائے جاتے ہیں۔ اور کسی ایسی سوسائٹی کا تصور بھی ناممکن ہے جس میں سارے افراد کے مفادات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوں۔ ان حقائق کے ہوتے ہوئے اگر ہم ایک ریاست کے لئے ایک ہی رائے کے طالب ہوں تو یہ سوائے ایک پارٹی اسٹنٹ یا ایک فرد کی حکومت کے ممکن نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ نظام زندگی رائے عامہ پیدا کرنے میں سخت ناکام ہوا ہے۔

(Alfred Colbon, the crisis of civilization, P.112)

الفرڈ کابن کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثریت کی رائے تو بہت بڑی بات ہے ایک فرد واحد کی صحیح رائے بھی معلوم نہیں کی جاسکتی کیونکہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ ان کی اپنی رائے نہیں ہوتی بلکہ دباؤ کے تحت نکلی ہوئی رائے ہوتی ہے لیکن اگر اکثریت کی رائے معلوم بھی ہو جائے تو پھر بھی اکثر حالتوں میں جمہوری نظام میں اقلیت کی حکومت ہوتی ہے اکثریت کی نہیں ہوتی۔ خصوصی طور پر جبکہ ملک میں دو سے زیادہ پارٹیاں ہوں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جمہوری نظام میں کسی شخص پر کوئی قدغن نہیں کہ وہ الیکشن میں کھڑا نہ ہوسکے بلکہ ہر شخص اس مقابلہ میں بالکل آزاد ہے۔ اگر ایک حلقہ انتخاب میں تین لاکھ ووٹر ہیں اور چھ امیدوار الیکشن میں کھڑے ہوئے تو جو امیدوار پچاس ہزار ایک ووٹ لے جائے گا وہ کامیاب ہے۔ اور وہ بڑی ڈھٹائی سے سینے پر ہاتھ مار کر یہ کہے گا کہ میں عوام کا نمائندہ ہوں حالانکہ دو لاکھ انچاس ہزار نو سو ننانوے لوگوں نے اس عوامی نمائندہ ہونے کے دعویدار کو ووٹ نہیں دیا۔ لہذا ایک طرف تو عوام کے احتجاج کو یہ کہہ کر تسلی دی جاتی ہے کہ یہ آپ ہی کا نمائندہ ہے۔ آپ ہی کے ووٹوں سے کامیاب ہوا ہے، حالانکہ ووٹ تو اس کو ایک نہایت قلیل تعداد نے دیئے تھے۔ اور دوسری طرف نمائندہ صاحب چونکہ پچاس ہزار ایک ووٹ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نمائندہ ہیں، لہٰذا وہ ہر معاملہ میں انہیں آدمیوں کی ہر جائز و ناجائز مدد کریں گے اور اپنے حلقہ کے دوسرے ووٹروں کی پرواہ نہیں کریں گے۔ اور جن ووٹروں نے انھیں ووٹ نہیں دئیے تھے وہ بھی اپنے ذہن میں اس کو اپنا نمائندہ نہیں سمجھتے۔

۱۰۔ جمہور کا ادبی اخلاقی اور نفسیاتی اثرات سے متاثر ہونا یقینی ہے۔ ایسی صورت میں ریاست کے لئے کوئی مستقل اخلاقی معیار اور قانون کے لئے پائیدار اخلاقی بنیاد نہیں رہتی۔ اگر جمہور کے اندر بڑے بڑے میلانات نشوونما پانے لگیں تو ریاست اور قانون دونوں جمہور اور ان کے میلانات ہی کے تابع ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ باشندے اگر تباہی کی جانب ایک قدم چلتے ہیں۔ تو ریاست ان کو سو قدم دھکیلتی ہے۔ اس طرح انسانیت کی تباہی و بربادی کا راستہ مختلف ہو جاتا ہے۔ اس کی زندہ مثال دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک برطانیہ کی ہے جہاں حکومت نے ہم جنسی کا قانون پاس کر کے لوگوں کو بداخلاقی کے قعر مذلت میں دھکیل دیا ہے۔

یہ جنسی بے راہ روی جو آج یورپ، امریکہ وغیرہ میں پھیلی ہوئی ہے اور دوسرے ممالک میں پھیل رہی ہے یہ اسی جمہوریت کے اثرات اور نتائج ہیں۔ عورت نے جب یہ سمجھا کہ میں اب بالکل آزاد ہوں۔ مجھے کوئی روکنے اور ٹوکنے والا نہیں۔ دوسری طرف جمہوریت نے جو سرمایہ دارانہ نظام لوگوں کو دیا اس نے افراد کی شخصی ملکیت کو غیر محدود حق دے دیا۔ جس کی وجہ سے ہر شخص پیسہ کما کر آگے بڑھنے کی فکر میں لگ گیا۔ پیسہ کمانے کی خواہش کی تکمیل صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اپنی ذات کے لئے کوشش کرنے اور سعی کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہو وہ اس کا مالک بنے۔ یہی ایک جذبہ انسانی کوششوں کا اصل محرک ہے۔ نبض حیات میں تموج ہے تو اسی کی وجہ سے اور نظام عالم کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑ رہا ہے تو اسی کی حرارت سے۔ جب جمہور کے ہر فرد کے ذہن میں یہ شی بیٹھ گئی تو اب اس نے نظام سرمایہ داری کے اصول مسابقت کو اپنایا۔ یہ مسابقت نہ صرف مختلف طبقوں اور گروہوں کے درمیان شروع ہوئی بلکہ ایک ہی طبقہ اور ایک ہی گروہ کے مختلف افراد میں بھی پائی جانے لگی۔ جہد للبقاء (Struggle of Existence) کی کوکھ سے نکلی ہوئی اس ڈائن نے ہر مرد و زن کو تاخت و تاراج کر دیا۔ مگر اس کے سحر کا کمال یہ ہے کہ لوگ تباہی کے عمیق غاروں کی طرف لڑھکتے ہوئے بھی یہی محسوس کر رہے ہیں کہ وہ ترقی کے بام بلند پر جا رہے ہیں۔ اسی جذبہ مسابقت کے تحت عورت دفتروں اور فیکٹریوں میں کام کرنے کے لئے گھر سے نکلی۔ پرانے تمام بندھنوں کو توڑا۔ شرم و حیاء کے لباس کو تار تار کیا اور دفتروں اور فیکٹریوں میں جا کر کام کرنے لگی۔ گویا چراغ خانہ سے شمع انجمن بننے کے لئے نکلی، لیکن اس تغیر نے اس صنف نازک کو مضطرب کیا۔ لہٰذا سوسائٹی پر اس کے جو اثرات پڑے وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک بچوں کی تربیت اور نگہداشت سے عام بے پروائی دوسرے جنسی انار کی۔ اور پھر اس جمہوری آزادی اور اس جمہوری نظام کی برکتوں سے ایسا معاشرہ پیدا ہوا جو جنسی بے راہ روی کے قعر ندامت کی طرف بگٹٹ دوڑ رہا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے پہلے عورت کو جمہوری حق دے کر باہر نکالا تھا، اب اس قدر پریشان ہو گئے ہیں کہ وہ اب پھر اسے گھر واپس لانے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ لیکن معاملہ اب ان کے بس میں نہیں رہا۔

© rasailojaraid.com